ڈیک نالے میں ایک دم ہی پانی آیا تھا۔ دو بھینسیں اور
بچے دیکھتے ہی دیکھتے غوطے کھانے لگے۔ دو بچے تو ذرا
نے اور تیراک بھی تھے۔ وہ تیر کر نالے سے نکل آئے
ایک چار پانچ سال کا بچہ بری طرح پانی میں گھر گیا۔ بچے کا
الم تھا۔ اس کا چاچا عطا محمد کھیتوں کی طرف سے آرہا
ہی نے اپنے ننھے بھتیجے کی چیخ و پکار سنی تو ڈیک نالے کی
دوڑا..... نیالے رنگ کا پانی وحشی ناگ کی طرح
یں مار رہا تھا اور اس کی سطح تیزی سے بلند ہو رہی تھی۔
نت اس سیلابی پانی میں کودنا سخت خطرناک تھا لیکن پانی
محمد کا پیارا چہیتا بھتیجا تھا۔ عطا محمد نے جان کی بازی
میں چند لمحے کی تاخیر بھی نہیں کی۔ وہ مٹیلے پانی کے رخ
پر کنارے کے ساتھ ساتھ بھاگتا کافی آگے نکل گیا۔ پھر اس
نے دیوانہ وار چھلانگ لگا دی وہ اپنے ڈبکیاں کھاتے بھتیجے
سے آگے تھا لہٰذا جب وہ اس کے قریب پہنچا تو عطا تڑپ کر
اس کی طرف بڑھا۔ بچہ پکارا "چاچا! مجھے ہاتھ دو..... مجھے
ہاتھ دو۔" اس کی آواز لرزہ خیز چیخ سے مشابہ تھی۔

عطا نے پورا زور لگا کر اپنا ہاتھ بچے کی طرف بڑھایا۔ بچہ
ہاتھ سے اور ہاتھ بچے سے چمٹ گیا..... کچھ ہی دیر بعد عطا محمد
لہروں سے لڑتا ہوا کنارے پر پہنچ گیا۔ اس کا ننھا بھتیجا اس کے
چھاتی سے چمٹا ہوا تھا۔ چاچے اور بھتیجے کو زندہ دیکھ کر دیکھنے
والوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

انچھوتی اور منفرد کہانیاں پڑھنے کے شائق قارئین کے لیے خصوصی پیشکش

طاہر جاوید مغل

بدقسمت

محبت اور محبتوں کی لازوال کہانیاں لکھنے والے مغل صاحب کی
ایک مختصر تحریر، ایسی کہانیاں اب ان کا خاصہ بنتی جا رہی ہیں۔

BY SALIM SALKHAN

عطا محمد اور اکبر علی دونوں بھائی تھے۔ اکبر علی بڑا تھا۔ باڑی پاڑی گاؤں میں دونوں کا زمینداراتھا حویلیاں بھی ساتھ ساتھ ہی تھیں۔ دونوں بھائیوں میں مثالی پیار اور سلوک تھا۔ دیہات میں زمینداروں کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کی اولاد زیادہ ہو مگر ہر گھرانے میں تو یہ خواہش پوری نہیں ہوتی۔ اکبر علی کے بس دو بیٹے تھے۔ عطا کی ایک بیٹی تھی اور ایک چھوٹا بیٹا تھا۔ اس دن سیلابی ریلے میں عطا نے جس بچے کو اپنی جان پر کھیل کر بچایا تھا وہ اس کا بڑا بھتیجا اسلم تھا۔ اسلم بچپن سے ہی بڑا گورا چٹا اور گول مٹول تھا۔ عطا اسے سارا سارا دن گود میں اٹھائے پھرتا تھا۔ عطا کی بھرجائی کہا کرتی تھی "عطا تو نے تو چوم چوم کر میرے اچھو کا منہ ہی گھسا دینا ہے۔"

وہ دیوانہ وار اس سے محبت کرتا تھا پھر عطا کی شادی ہوئی اس کے اپنے بھی دو بچے ہو گئے لیکن اسلم کے لیے اس کی چاہت اور شفقت برقرار رہی۔ اس میں تھوڑی سی کمی بھی نہیں آئی۔

ان کے گھرانوں میں بچپن سے منگنی کا رواج بھی تھا۔ نجانے اکبر علی اور عطا محمد کے دل میں کیا آئی کہ انہوں نے بچپن میں ہی بچوں کو ایک دوسرے سے منسوب کر دیا۔ اسلم کا رشتہ چھ سال کی عمر میں ہی عطا کی بیٹی ریحانہ سے طے ہو گیا۔ یہ منگنی دھوم دھام سے ہوئی مہمان آئے کھانا پکایا گیا۔ اس روز شام کو عطا اپنے لاڈلے بھتیجے اسلم اور بیٹی ریحانہ کو ایک سجے ہوئے تانگے پر بٹھا کر "حضرت صاحب" کے آستانے پر لے گیا۔ حضرت صاحب ایک درویش منش انسان تھے۔ عام پیروں فقیروں سے بالکل مختلف تھے۔ حج کے بعد کچھ زیادہ ہی گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ عطا محمد کبھی کبھی ان کے پاس آتا تھا اور دعا حاصل کرتا تھا۔

اس روز بھی وہ دونوں بچوں کو ان کے پاس لے گیا۔ حضرت صاحب اپنی گھنی بھویں اٹھا کر بڑی دیر تک اسلم کی طرف دیکھتے رہے۔ عطا کو محسوس ہوا کہ ان کی نظریں اسلم کی پیشانی پر مرکوز ہیں۔ حضرت صاحب اور ان کے پیر و مرشد برکات صاحب کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ مقدر کا لکھا پڑھ لیتے ہیں۔ اس روز بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ حضرت صاحب پر ایک خاص قسم کی کیفیت طاری تھی۔ آنکھوں میں ہلکی سی سرخی اتری ہوئی تھی۔ وہ خوابناک آواز میں بولے۔

"یہ بھتیجا ہے تیرا؟"

"جی حضرت صاحب۔" عطا نے جواب دیا۔

"بڑا پیارا ہے تجھے؟"

"جی حضرت صاحب۔"

"لیکن...... جو کچھ تو نے اسے دیا ہے... ایک دن تو نے اس سے لے لینا ہے۔"

عطا کے سینے میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ اس نے چونک کر اپنی بیٹی کی طرف دیکھا۔۔۔ حضرت صاحب کیا بات کر رہے تھے۔ وہ حضرت کے رمزیہ لہجے کو سمجھ رہا تھا۔ وہ ایسے ہی کنایوں میں اظہار کیا کرتے تھے۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی بیٹی اسلم سے واپس لے لیتا۔ اس نے آج جو کچھ کیا تھا پورے خلوص کے ساتھ سچے دل سے کیا تھا...... اور خدا سے دعا بھی کی تھی کہ جس سفر کا آج آغاز ہوا ہے وہ خوشیوں کی منزل تک پہنچے۔

وہ لرزاں آواز میں بولا "حضرت صاحب! میں ایسا کیونکر کروں گا میری تو جان ہے ان دونوں بچوں میں۔ اسلم میری اولاد نہیں لیکن کسی وقت لگتا ہے کہ اولاد سے بھی بڑھ کر پیارا ہے۔"

"جو میں دیکھ رہا ہوں وہ تو نہیں دیکھ رہا...... اور نہ تو سمجھ رہا ہے۔"

"حضرت صاحب! آپ ہی تو کہتے ہیں کہ ارادے نیک ہوں تو ان کے نتیجے بھی نیک نکلتے ہیں۔ میرے ارادے میں کوئی کھوٹ نہیں حضرت جی...... پھر بھی بندہ بشر ہوں آپ میرے لیے اور ان بچوں کے لیے دعا کریں حضرت جی...... ہم سب ان دونوں کو ایک دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"میں دعا کروں گا اور ضرور کروں گا۔ دعائیں مقدر کو نہ بھی بدل سکیں تو انسان کو ضرور بدل دیتی ہیں۔"

اس روز حضرت صاحب نے جو بات کہی تھی وہ عطا نے بس اپنے تک ہی محدود رکھی۔ یہ بات کئی روز تک اس کے ذہن میں گردش کرتی رہی پھر آہستہ آہستہ محو ہو گئی۔ وقت گزرتا رہا...... بچے بڑے ہوتے رہے۔ چاروں بچے دونوں بھائیوں کی آنکھوں کا تارا تھے۔ خاص طور پر چاچو بھتیجے کی محبت تو مثالی تھی۔

دونوں بھائیوں کی بیویاں تھوڑا بہت پڑھی ہوئی تھیں۔ عطا نے بھی میٹرک کر رکھا تھا۔ ان دنوں میٹرک کی بھی بڑی اہمیت تھی۔ عطا کا شمار باڑی گاؤں کے پڑھے لکھے افراد میں ہوتا تھا۔ گاؤں میں پہلی بار اسی نے ٹریکٹر منگوایا اور ولایتی کھاد کا استعمال شروع کیا۔ دونوں بھائی اپنے بچوں کو اچھی تعلیم دلانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ریحانہ ساتویں میں پڑھ رہی تھی۔ اس کی اٹھان بتا رہی تھی کہ وہ اپنی جنتی ماں کی طرح لمبی اور خوبرو نکلے گی۔ اسلم دسویں میں تھا۔ پڑھائی کی طرف اس کا رجحان زیادہ نہیں تھا۔ وہ اسکول میں ہاکی کھیلتا تھا

"ہاکی" سے وہ کھیلنے کے علاوہ لڑائی جھگڑے کا کام بھی لے لیتا تھا۔ ان کی طبیعت میں تھوڑی سی تیزی تھی۔ بہرحال اپنے باپ سے وہ اب بھی ٹوٹ کر محبت کرتا تھا۔

کسی وقت عطا کے ذہن میں وہ بات آتی جو حضرت صاحب نے کئی سال پہلے کہی تھی۔ حضرت صاحب وفات پا چکے تھے لیکن ان کی بات زندہ تھی اور ابھی تک عطا کے ذہن کے کسی گوشے میں موجود تھی۔ وہ کسی وقت تنہائی میں بیٹھ کر سوچتا..... ایسا کیونکر ہو سکتا ہے..... کیسے ہو سکتا ہے۔ اسلم اب بھی اسے جان سے پیارا تھا۔ کسی وقت تو عطا کو یوں محسوس ہونے لگتا تھا کہ وہ اپنے بیٹے آصف سے ناانصافی کر رہا ہے۔ عجیب تعلق تھا چاہے جیسے میں پھر کسی وقت وہ یہ سوچتا شاید اس سے حضرت صاحب کی رمز سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ انہوں نے کوئی اور اشارہ دیا ہے جسے وہ کوئی اور معنی پہنا رہا ہے۔ اکثر وہ اس بارے میں سوچتے سوچتے الجھ جاتا اور پھر سب کچھ ذہن سے جھٹک کر خود کو کسی کام میں مصروف کر لیتا۔

اسلم نے میٹرک تو بڑے بھلے نمبروں سے پاس کر لیا لیکن اس کے بعد اس کا دل پڑھائی سے اچاٹ ہو گیا۔ عطا نے اسے ہر طریقے سے سمجھایا۔ نرم گرم ہر طرح کا لہجہ اختیار کیا وہ عطا کے سامنے تو اقرار میں سر ہلا دیتا تھا لیکن عملی طور پر صورت حال میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ کھیتوں میں چلا جاتا۔ مزارعوں اور مزدوروں سے گپیں لگاتا رہتا یا پھر فلم دیکھنے کے لیے شہر چلا جاتا۔ اسلم اور عمارہ اکٹھے پل بڑھ کر جوان ہوئے تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ایک دوسرے سے منسوب ہیں شاید یہی وجہ تھی کہ ان میں ایک جھجک سی تھی وہ آپس میں بات نہیں کرتے تھے..... ایک دوسرے کا سامنا بھی کبھی کبھار ہی ہوتا تھا۔

کوئی ایک سال تک فارغ رہنے کے بعد اسلم کو ایک بالکل مختلف شوق چرایا۔ باڑی گاؤں سے تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلے پر سلطان پور نامی قصبہ تھا۔ یہاں نہر کے کنارے چھوٹا سا بس اڈا تھا اور بازار بھی تھا۔ اسلم نے یہاں باڈی بلڈنگ کا کلب کھول لیا۔ وہ لاہور سے ویٹ لفٹنگ کا بہت سا سامان ٹرالے پر لاد کر لایا اور ایک احاطے میں یہ سب چیزیں "سیٹ" کر دیں۔ دیگر کئی احاطوں کی طرح یہ احاطہ بھی اکبر علی اور عطا محمد کی مشترکہ ملکیت تھا۔ اس کام کے لیے اکبر علی ہرگز راضی نہیں تھا مگر عطا کے سمجھانے بجھانے سے اس نے اسلم کو اجازت دے دی تھی۔ عطا نے بڑے بھائی سے کہا تھا۔ "بھائی! وہ اپنی مرضی سے ایک رستے پر چلنا چاہتا ہے تو اسے چلنے دیں ٹھیک ہے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے ہمارے مزاج کے

ملازمت نہیں لیکن کچھ نہ کرنے سے کچھ کرنا تو اچھا ہے۔"

اسلم نے کلب کا سامان وغیرہ ڈالنے پر کوئی ایک لاکھ روپیہ خرچ کر دیا تھا۔ اگرچہ اتنی بڑی رقم انہوں نے بیج اور کھاد وغیرہ پر لگائی ہوتی یا کوئی مشینری وغیرہ خریدی ہوتی تو اگلے سال لاکھ کا ڈیڑھ لاکھ بنتا۔ یہ کلب تو خواہ مخواہ کا بکھیڑا تھا اگر یہ کام کسی بڑے شہر میں کیا جاتا تو شاید کچھ آمدن ہو جاتی۔ یہاں دیہاتی علاقے میں تو خرچے ہی پورے ہوتے تھے۔

جانے کیوں عطا محمد محسوس کر رہا تھا کہ اسلم ان سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ اسلم کی والدہ اس سے بہت محبت کرتی تھی لیکن وہ اکثر ان سے جھگڑ پڑتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ دھیرے دھیرے ان کی توجہ اپنے چھوٹے بیٹے تنویر کی طرف زیادہ ہو گئی تھی یا کم از کم اسلم کو اس معاملے میں فوقیت حاصل نہیں رہی تھی۔ اسکول میں اسلم کے ایک استاد ہاشمی صاحب تھے۔ وہ ہاکی ٹیم کے انچارج تھے اور خود بھی ہاکی کے کھلاڑی رہے تھے۔ انہوں نے ٹیم میں اسلم پر خصوصی توجہ دی تھی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ اسلم ایک بڑے زمیندار کا بیٹا تھا لیکن ان کے ساتھ ساتھ انہیں اسلم میں کوئی بات نظر بھی آتی تھی۔ وہ اپنے مخصوص لہجے میں کہا کرتے تھے "یہ منڈا آگے نکل سکتا ہے۔"

ان کی خواہش تھی کہ اسلم لاہور کے کسی اچھے کلب کی طرف سے ہاکی کھیلے لیکن یہ منصوبہ بھی دھرا رہ گیا تھا۔ گوجرانوالہ میں ہاکی کھیلتے ہوئے دوستوں میں کسی بات پر جھگڑا ہوا تھا۔ اسلم اس جھگڑے میں پیش پیش تھا۔ ہاشمی صاحب نے اسے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی لیکن وہ الٹا ان سے الجھ پڑا۔ اتنی بد تمیزی کی کہ ایک موقع پر اسلم نے طیش میں آ کر ہاشمی صاحب کو دھکا دے دیا۔ وہ گرتے گرتے بچے اور خاموشی سے چلے گئے۔ بعد ازاں اسلم کو اس بات پر افسوس بھی ہوا۔ وہ ہاشمی صاحب سے معافی مانگنے گیا لیکن انہوں نے ملنے سے انکار کر دیا۔ بعد ازاں وہ باپ عطا کے ساتھ گیا۔ ہاشمی صاحب نے اسے معاف تو کر دیا لیکن ان کے درمیان پہلے جیسی گرمجوشی پھر کبھی نہ آ سکی۔ یوں یہ ہاکی والا باب بھی ختم ہو گیا۔

ایک روز عطا کی بیوی ثریا نے اکیلے میں عطا سے بات کی اور کہنے لگی "بہت دنوں سے ایک بات میرے دل میں ہے۔ آپ سے کہنا چاہ رہی ہوں۔"

"کہو میں سن رہا ہوں۔" عطا چونک کر بولا۔

"کہیں ہم نے ریحانہ کے سلسلے میں کوئی غلطی تو نہیں کر دی ہے۔"

"کیا مطلب؟" عطا کے ماتھے پر بل آ گیا۔

"آپ میری بات کا برا نہ منائیں۔ میں ایک ماں ہوں اور ماں کو بیٹی کے بارے میں زیادہ پتا ہوتا ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے لگتا ہے کہ ریحانہ کی توجہ اسلم کی طرف نہیں ہے۔"

"پہیلیاں کیوں بجھوا رہی ہو۔" عطا نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

ثریا نے ذرا سنبھل کر بات جاری رکھی "پہلے پہلے مجھے یہ لگتا تھا کہ ریحانہ ہماری طے کی ہوئی بات پر راضی ہے لیکن۔۔۔ اب۔۔۔۔۔ شاید آہستہ آہستہ اس کی سوچ بدل رہی ہے۔ تھوڑے دن پہلے میں نے ذرا ٹٹولنے کے لیے اس سے بات کی تو کہنے لگی "میرے بارے میں ابھی ایسی باتیں بالکل نہ سوچیں۔ مجھے پڑھنے دیں۔" مجھے لگتا ہے کہ اسلم کے طور اطوار دیکھ کر وہ بھی۔۔۔۔۔ مایوس ہے۔"

"کیا ہوا ہے اسلم کے طور اطوار کو؟" عطا پھنکار کر بولا "غنڈا ہے بدمعاش ہے۔ ٹلکے اڑاتا ہے؟"

"اللہ رحم کرے میں یہ کب کہہ رہی ہوں۔" ثریا کانپ کر بولی "میں نے تو بس یہ کہا ہے کہ آپ کی بچی آگے پڑھنا چاہتی ہے۔"

"تو کون روکتا ہے اسے آگے پڑھنے سے؟" عطا بپھر گیا "لیکن ایک بات تم بھی اپنے ذہن میں رکھنا میں اسلم کے خلاف کوئی بات سننا پسند نہیں کروں گا۔ تم سمجھ رہی ہو نا میری بات؟"

ثریا جلدی سے اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔

کچھ دیر بعد جب عطا نے اکیلے میں بیٹھ کر ذرا ٹھنڈے دل سے سوچا تو اسے ثریا کی بات اتنی بے وزن نہیں لگی۔ ریحانہ آگے پڑھنا چاہتی تھی۔ لاہور یا گوجرانوالہ کے کسی کالج میں داخلہ لینا چاہتی تھی۔ کبھی کبھی وہ عطا محمد کے گلے میں باز و ڈال کر بڑے لاڈ سے کہتی تھی "ابا جان! دیکھنا میں آپ کو پڑھ کر دکھاؤں گی۔ اگر کچھ اور نہ بھی بن سکی تو لیکچرار تو ضرور بنوں گی۔ انگلش کی لیکچرار ایسے فرفر انگریزی بولوں گی کہ آپ اور امی منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔"

ریحانہ سے بڑا پیار تھا عطا کو۔۔۔۔۔ لیکن اپنے بھتیجے سے شاید اس سے بھی بڑھ کر تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ مسئلہ کیسے حل ہوگا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ شوہر تعلیم کے معاملے میں بیوی سے۔۔۔۔۔۔ پیچھے ہو تو اکثر وہ اسے انا کا مسئلہ بنا لیتا ہے۔ اکثر یہ مسئلہ گھن کی طرح ازدواجی زندگی کو ہی چاٹنا شروع کر دیتا ہے۔ اس نے ایک بار پھر اسلم کو سمجھانے بجھانے کا سلسلہ شروع کیا۔ وہ اسے ایک بار پھر پڑھائی کی طرف مائل کرنے لگا۔ اس نے کہا "اسلم پتر تم جو کچھ کر رہے

ہو کرو لیکن ساتھ میں کچھ وقت پڑھائی کو بھی دینا شروع کرو۔ یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ تم سائنس ہی رکھو۔۔۔۔۔ آرٹس کے مضمون لے لو۔ ان میں سے بھی تم آسان مضمون چن سکتے ہو۔ اگر کالج نہیں جانا تو میں تمہیں اچھی ٹیوشن رکھوا دیتا ہوں۔ پرائیویٹ طالب علم کے طور پر بھی بی اے تک جا سکتے ہو۔۔۔۔۔"

عطا کے سامنے اسلم بولتا نہیں تھا۔ بس اقرار میں سر ہلاتا رہتا ہوں ہاں کرتا رہتا تھا۔ عطا کے کہنے پر وہ لاہور سے کچھ کتابیں وغیرہ بھی لے کر آیا۔ دو چار ہفتے شاید اس نے کچھ پڑھا لیکن اس کے بعد ایک بار پھر پرانی روٹین کی طرف لوٹ گیا۔ وہی یار باز، وہی بلڈنگ کلب۔۔۔۔۔ وہی دوستوں کے ساتھ گپ شپ۔ وہی سیر سپاٹا۔ محسوس ہوتا تھا کہ پڑھائی میں اس کا دل ہی نہیں ہے۔

برسوں پہلے حضرت صاحب کی کہی ہوئی بات عطا محمد کے ذہن میں آتی اور وہ یہ سوچ کر لرز جاتا کہ کہیں وہ اسی طرف تو نہیں جا رہے جس طرح حضرت صاحب نے اشارہ کیا تھا۔ وہ خود کو تسلی دیتا تھا کہ ایسا نہیں ہونے دے گا۔ وہ اس سلسلے میں اور دعا دلوں کر رہا تھا لیکن صورتِ حال وہی تھی کہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

ایک اسٹیج ایسی آئی کہ جو بات پہلے دبی دبی تھی وہ بالکل عیاں ہو گئی۔ خاندان میں سب کو اندازہ ہو گیا کہ اسلم اور ریحانہ کی بات "الجھن میں پڑ گئی ہے۔ دونوں گھروں کی دیوار ملی ہوئی تھی مگر آمد و رفت دھیرے دھیرے کم ہو گئی۔ ریحانہ تو اب تایا کے گھر نہیں جاتی تھی۔ اس کا رویہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ وہ اپنے لیے دوسرا راستہ چن رہی ہے۔ اکبر اور ثریا دونوں اس حوالے سے پریشان تھے مگر عطا کی پریشانی سب سے بڑھی ہوئی تھی۔ وہ اسلم کو کسی صورت کھونا نہیں چاہتا تھا مگر وہ ریت کی طرح دھیرے دھیرے عطا کی مٹھی میں سے پھسل رہا تھا۔

پھر ایک وقت ایسا آیا جب یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ ریحانہ اور اسلم کا رشتہ نہیں ہو سکے گا۔ ریحانہ نے ایف اے اچھے نمبروں سے پاس کر لیا تھا۔ اب اس کا ارادہ کالج کی طرف جانے کا تھا۔ وہ انگلش یا پولیٹیکل سائنس میں ماسٹرز کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ دوسری طرف اسلم نے پرانی بلڈنگ "کلب" بیچ کر کھا لیا تھا اور اب اسی جگہ وہ کچھ اور کرنا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں ایک دوست اس کا شریک تھا۔ اکبر علی نے اکھڑے بیٹے کو قابو میں رکھنے کے لیے زمین اس کے نام بھی کی تھی۔ یہ وہی وسیع احاطہ تھا جہاں پرانی بلڈنگ کا کلب وغیرہ بھی چلاتا رہا تھا۔ یہ ایک

قیمتی جگہ تھی اور صرف اکبر کے حصے کی "ویلیو" ہی تیس چالیس لاکھ روپے کی تھی۔ اکبر نے یہ سب کچھ اس لیے کیا تھا کہ بیٹے کو اپنی اہمیت اور ذمے داریوں کا احساس ہو اور اکبر کے ساتھ اس کے رویے میں بھی مثبت تبدیلی آئے۔

عطا کے ذہن میں یہ بات ہمیشہ موجود رہی تھی کہ کیا اسلم اپنے رشتے کے خاتمے کو آسانی سے قبول کر لے گا؟ اس حوالے سے کبھی کبھی ایک طرح کا خوف بھی اس کے ذہن میں جنم لیتا تھا۔ اسلم نے عطا کے سامنے کبھی آنکھ اٹھا کر بات نہیں کی تھی۔ اب بھی وہ اپنے چاچو کی بات کو کسی بھی شخص کی بات سے زیادہ اہمیت دیتا تھا۔ اب بھی ان دونوں کے درمیان محبت کا رشتہ کسی نہ کسی درجے میں موجود تھا لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ حقیقت تھی کہ پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہے۔

ایک روز عطا نے اپنی بیوی کی زبانی ایک اڑتی اڑتی سی بات سنی اور اسے چند لمحوں میں یوں محسوس ہوا کہ وہ سرتا پا پسینے میں ڈوب گیا ہے۔ ثریا کی زبانی عطا کے کانوں تک پہنچنے والی بات کچھ اس طرح تھی۔ اسلم نے کہیں اپنی ماں سے کہا تھا کہ ریحانہ کے ساتھ اس کی منگنی ہوئی ہے ۔۔۔۔۔ اور اگر وہ جوائی (داماد) بنے گا تو اپنے چاچو کا ہی بنے گا۔"

بظاہر یہ چند لفظ تھے لیکن یہ چند زہریلے تیر تھے جو عطا کے اندر گہرائی تک اتر گئے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے خوں رنگ مناظر والی ایک کھڑکی کھل گئی۔ یہ مستقبل کی کھڑکی تھی اور وہ اس میں سے بہت دور تک دیکھ رہا تھا۔ عطا محمد ایک دور اندیش اور فہیم شخص کا نام تھا۔ ابھی کچھ نہیں ہوا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ وہ اس "بہت کچھ" سے بچنا چاہتا تھا۔ ہر صورت میں بچنا چاہتا تھا۔ اسلم کو جتنا وہ جانتا تھا شاید ہی کوئی اور جانتا ہو اور اسے معلوم تھا کہ اسلم میں ایک، اک قسم کی خودسری موجود ہے۔ وہ اس خودسری کے ڈانڈے۔۔۔۔ بہت دور جاتے دیکھ رہا تھا۔ ریحانہ اس کی اولاد تھی۔ وہ اسے دل و جان سے چاہتا تھا۔ وہ اس سے زبردستی نہیں کر سکتا تھا اور نہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس حتمی نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ ریحانہ اسلم کو پسند نہیں کرتی اور جب وہ پسند نہیں کرتی تھی تو پھر بات ختم ہو جاتی تھی۔ وہ ان باپوں میں سے ہرگز نہیں تھا جو اپنی اغراض و خواہشات کے لیے اولاد پر اپنی مرضی ٹھونستے ہیں۔

دیگر الفاظ میں حضرت صاحب کی کہی ہوئی بات سو فیصد درست ثابت ہو چکی تھی ۔۔۔ اسلم اور ریحانہ کا رشتہ تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ اب تو بس اس صورتِ حال کے نتائج سے نمٹنا باقی رہ گیا تھا۔

عطا محمد کسی وقت اکیلے میں بیٹھ کر سوچتا تو حیران رہ جاتا۔ وقت کس طرح انسانوں کو اور ان کے حالات کو بدل دیتا ہے؟ ایک دور تھا جب یہ بات عطا کے تصور میں بھی نہیں آ سکتی تھی کہ وہ ریحانہ کو واپس لے گا۔ لیکن یہ ہوا تھا اور سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے ہوا تھا۔ وہی بھتیجا جو عطا کی آنکھ کا تارا تھا اور جس سے کچھ دیر کے لیے دور رہنا بھی اسے شاق گزرتا تھا۔ اب اس سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ بلکہ کبھی کبھی اس کے حوالے سے ایک عجیب طرح کا خوف بھی عطا کے ذہن میں جاگزیں ہو جاتا تھا۔

پھر ایک روز یہ خوف مزید ٹھوس شکل میں سامنے آ گیا۔ عطا کا ایک سسرالی عزیز اپنے بال بچوں سمیت ہالینڈ میں رہتا تھا۔ وہ لاہور آیا تو عطا اور ثریا اس سے لاہور ائیرپورٹ پر ملنے کے لیے گئے۔ وہ دو روز لاہور ہی میں رہے۔ ریحانہ اپنے امتحانوں کی وجہ سے ان کے ساتھ نہیں تھی۔ دو روز بعد وہ واپس گاؤں پہنچے۔ اسی روز بڑے بھائی اکبر علی نے اسے اکیلے میں بلایا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ دل گیر لہجے میں بولا "عطا! تو ریحانہ کا رشتہ جلد سے جلد کہیں کر دے۔ پتا نہیں کیوں مجھے ہر وقت دھڑکا سا لگا رہتا ہے اللہ نہ کرے۔ اچھو کی طرف سے کوئی چھوٹی موٹی بات بھی ہو گئی تو میں ساری زندگی تیرے سامنے اکھیاں نہیں اٹھا سکوں گا۔"

"کیا۔ کوئی بات ہوئی ہے؟" عطا نے چونک کر پوچھا۔

"نہیں۔ ہوئی تو نہیں پر ہو تو سکتی ہے نا۔ کیا پتا کس ویلے یہ منڈا بس سے باہر ہو جائے۔ مجھے تو اس کی کچھ سمجھ نہیں آتی۔ ریحانہ تیری دھی بعد میں ہو گی پہلے میری ہے۔ خدا دی قسمیں مجھے اس کی فکر تجھ سے بڑھ کر ہے۔"

☆☆☆

چند ماہ مزید گزر گئے۔ عطا محمد چپکے چپکے تیاری میں لگا رہا۔ اس نے دو تین جگہ اپنی زمین فروخت کر دی۔ ایک ڈیری فارم ختم کر دیا۔ کچھ زمین ٹھیکے پر دے دی۔ پھر ایک روز اس نے وہ کیا جس کا منصوبہ ایک عرصے سے اس کے ذہن میں پروان چڑھ رہا تھا۔ یہ ایک عجیب سا فیصلہ تھا۔ اس قسم کا فیصلہ عطا جیسا دور اندیش اور حساس شخص ہی کر سکتا تھا۔ اپنے اس فیصلے کی خبر عطا نے کسی گھر والوں کو کان نہیں ہونے دی تھی۔ یہاں تک کہ اپنے بچوں کو بھی نہیں۔ انہیں بھی یہی معلوم تھا کہ وہ گرمیوں کی چھٹیوں میں دس پندرہ دن کے لیے لاہور جا رہے ہیں۔ روانگی سے بس چند گھنٹے پہلے ہی انہیں پتا چل سکا تھا کہ وہ انگلینڈ جا رہے ہیں ۔۔۔ اور مکمل حقیقت کا علم انہیں مزید تین ہفتے بعد ہوا تھا۔ اور مکمل حقیقت یہ تھی کہ وہ ہمیشہ کے لیے انگلینڈ آ گئے ہیں اور اب انہیں زندگی میں باقی جو کچھ کرنا ہے، وہیں کرنا ہے۔

مختصر سی تو فیملی تھی میاں بیوی اور دو بچے۔ عطا نے اہل خانہ کو "نوٹنگھم" کی ایک مسجد میں بٹھا کر ان سے عہد لے لیا کہ کم از کم دس سال تک وہ اپنی یہاں موجودگی کے بارے میں کسی پاکستانی شخص کو کچھ نہیں بتائیں گے۔ کسی صورت میں انگلینڈ سے باہر نہیں جائیں گے بلکہ یہی کوشش کریں گے کہ انہیں اس شہر سے باہر بھی نہ جانا پڑے۔

عطا کے اہل خانہ نے ہمیشہ بغیر کسی سوال و جواب اس کی بات مانی تھی۔ انہوں نے یہ بات بھی مان لی۔ انہیں غیر متزلزل یقین تھا کہ ان کے گھرانے کا سربراہ جو کچھ بھی سوچے گا، اس میں ان کی بہتری پوشیدہ ہو گی۔ ویسے حالات کی انہیں بھی بہت حد تک خبر تھی۔ وہ سب اچھو کی اکھڑ طبع اور ناعاقبت اندیشی سے آگاہ تھے۔ اچھو بظاہر ایک خاموش اور کم گو شخص تھا لیکن ایسے لوگ زیادہ ضرر رساں بھی ثابت ہوتے ہیں۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا۔ ایک دم کسی جمی جمائی زندگی سے قطع تعلق کر لینا، ہر ناتا توڑ لینا۔ ایک انوکھا اور انوکھا کام تھا۔ شروع میں تو وہ سب پریشان ہوئے اور ریحانہ کی آنکھیں اکثر بھیگی ہی رہتی تھیں، مگر پھر دھیرے دھیرے وہ زندگی کے دھارے میں بہنے لگے۔ اپنے گھرانے کے سربراہ کے عجیب و غریب فیصلے سے انہوں نے مطابقت پیدا کرنا شروع کر دی۔ انگلینڈ آنے کے آٹھ دس روز بعد عطا محمد نے اپنے بھائی اکبر علی کو ایک خط لکھا تھا۔ آنسوؤں میں ڈوبے ہوئے اس طویل خط میں اس نے اپنے پیارے بھائی کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ ہر بات کھول کر بیان کر دی تھی اگر نہیں بتایا تھا تو اپنا اتا پتا نہیں بتایا تھا۔ یہ خط عطا نے پوسٹ بھی ایک خاص طریقے سے کروایا تھا۔ یہ خط ایک جان پہچان والے شخص کے پاس ایمسٹرڈیم پہنچا اور پھر وہاں سے پاکستان گیا تھا۔ اس خط کے بعد عطا کا اپنے پیارے گاؤں اور وہاں کے حالات و مسائل سے ہر ناتا ٹوٹ گیا تھا۔ عطا کے فیصلے ایسے ہی ہوا کرتے تھے۔ مصمم اور دو ٹوک کر دینے والے۔

نوٹنگھم میں آصف نے کمپیوٹر سائنس میں داخلہ لے لیا تھا۔ ریحانہ نے بھی اپنی پڑھائی پھر سے شروع کر دی تھی۔ انگریزی زبان میں عبور حاصل کرنے کی خواہش مند تھی۔ اس کا یہ شوق یہاں بڑے اچھے طریقے سے پورا ہو سکتا تھا۔

ریحانہ خوبرو لڑکی تھی۔ گوری چٹی اور اونچی لمبی کسی لہلہاتی دھریک کی طرح۔ اس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک اور چہرے پر معصومیت کا اجالا رہتا تھا۔ عطا جب بھی اسے دیکھتا فوراً نگاہ پھیر لیتا۔ نظر اپنوں ہی کی تو لگتی ہے اس کے دل سے دعا نکلتی "اے خدا! میری نیک بھولی بھالی سی بچی کو کوئی اچھا بر دینا۔ اس کی قسمت میں سکھ و آرام لکھنا میرے مالک تو جانتا ہے کہ اس بچی کے سکھ کے لیے میں کہاں سے کہاں آیا ہوں کیسے کیسے رشتے ناتے ایک ہی جھٹکے میں توڑ دیے ہیں میں نے۔"

ایک روز ثریا نے عطا کو چپکے سے بتایا کہ پڑوس میں رہنے والی ایک عورت ان کے گھر آئی تھی۔ اسے یہاں بیگم نور کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس کا تعلق کراچی سے ہے اور وہ یہاں اپنے بیٹے کے ساتھ رہتی ہے۔ بہت سنجیدہ سی خاتون ہے اس سے مل کر اسے بہت خوشی ہوئی ہے۔ ثریا کی اتنی لمبی تمہید پر عطا محمد الجھ گیا۔ خشک لہجے میں بولا "لیکن بات کیا ہے؟"

ثریا کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔ وہ کہنے لگی "اصل بات یہ ہے کہ بیگم نور کو ریحانہ پسند آئی ہے۔ وہ بیٹھی بیٹھی رہیں بس ریحانہ کی باتیں ہی کرتی رہیں۔"

"بیگم تم اب بھی پہیلیاں بجھوا رہی ہو۔ مجھے صاف کیوں نہیں بتاتی ہو۔"

ثریا نے کچھ ڈرتے ہوئے کچھ جھجکتے ہوئے عطا محمد کو بتایا اس کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔

بیگم نور کے خاوند کوئی چار سال پہلے ٹریفک کے ایک حادثے میں جاں بحق ہو گئے تھے۔ ان کا ایک بیٹا امریکا چلا گیا تھا۔ اپنے دوسرے بیٹے جہاں زیب کے ساتھ وہ یہاں نوٹنگھم میں رہ رہی تھیں۔ جہاں زیب یہاں [illegible] افراد کے ایک ادارے میں بطور سائیکالوجسٹ کام کرتا تھا۔ وہ ایک محنتی اور خوش اخلاق نوجوان تھا۔ اس نے ریحانہ کو آتے جاتے دیکھا تھا اور پسند کیا تھا۔ یہاں انڈر گراؤنڈ ٹرین میں سفر کرتے ہوئے ان دونوں کے درمیان ایک دو بار بات چیت بھی ہوئی تھی۔ اس بات چیت کے سلسلے کو ریحانہ نے ثریا کو بے خبر نہیں رکھا تھا۔ اب لڑکے کی ماں ریحانہ کو دیکھنے اور گھر والوں سے ملنے خود آئی تھی۔

اگلے ڈیڑھ دو ماہ میں یہ سلسلہ تیزی سے آگے بڑھا۔ عطا کو بھی جہاں زیب نامی یہ لڑکا اچھا لگا۔ اس کی والدہ بھی سمجھدار اور پڑھی لکھی خاتون تھیں وہ ان لوگوں میں سے تھیں جو زیادہ ٹوہ نہیں لگاتے۔ انہیں اس بات سے غرض نہیں تھی کہ عطا اور اس کی فیملی پاکستان میں کہاں سے آئی ہے کیوں آئی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ عطا محمد نے بیگم نور سے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ وہ لوگ اگر اب یا آئندہ کبھی اس بارے میں کوئی سوال کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو پھر اس معاملے کو یہیں ختم کر دیں۔

جہاندیدہ بیگم نور سمجھ گئی تھیں کہ اپنی کسی بھی مجبوری کی وجہ سے وہ لوگ اپنے ماضی سے ناتا توڑے ہوئے ہیں۔ بہر حال یہ لوگ بیگم نور کو پسند آئے تھے۔ ان کے اندر کی سچائی اور نیکی کو بیگم نور نے محسوس کیا تھا۔ جلد ہی بات ریحانہ اور جہاں زیب کے رشتے تک پہنچ گئی اور پھر ان دونوں کی منگنی بھی ہو گئی۔ عطا محمد کافی سارا روپیہ اپنے ساتھ یہاں لایا تھا وہ کسی اچھے علاقے میں ریڈی میڈ گارمنٹس کی شاپ کھولنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ جہاں زیب نے اس سلسلے میں عطا اور آصف کی بے لوث مدد کرنا شروع کر دی تھی۔ طے یہ ہوا تھا کہ کرسمس کے فوراً بعد جہاں زیب اور ریحانہ کو ازدواجی رشتے میں باندھ دیا جائے گا۔ عطا اور آصف کو امید تھی کہ تب تک وہ شاپ والے مسئلے سے بھی فارغ ہو چکے ہوں گے۔

ان دنوں عطا کو اپنی بیٹی کی آنکھوں میں زندگی کی چمک اور خوشیوں کے رنگ دکھائی دیتے تھے۔ بیٹیاں بے زبان ہوتی ہیں لیکن ان کی آنکھیں تو بولتی ہیں اور یہ آنکھیں بے زبان۔ خاموشی اپنے "ابو" کا شکریہ ادا کرتی تھیں "ابو آپ کا شکریہ آپ نے میرے لیے اچھا سوچا میرے لیے اچھا چنا۔"

ان آنکھوں کو دیکھ کر عطا محمد نہال ہو جاتا تھا۔ اپنی دھرتی اور اپنے لوگوں سے مستقل جدائی کا غم کہیں دور پس منظر میں چلا جاتا تھا اور یہ آواز عطا محمد کے کانوں میں گونجنے لگتی تھی۔ "تم نے بے شک ایک انوکھا فیصلہ کیا۔ لیکن تم نے ایک اچھا فیصلہ کیا عطا محمد!"

اس کے بعد سب کچھ پروگرام کے مطابق ہوتا چلا گیا۔ شاپ والا کام بھی مکمل ہو گیا۔ ریحانہ کے سمسٹر بھی ختم ہو گئے۔ طے یہ ہوا کہ ریحانہ شادی کے بعد بھی پڑھائی جاری رکھے گی بلکہ بیگم نور اور جہاں زیب کی خواہش تھی کہ وہ ایسا کرے۔

کرسمس کے بعد دوسرے ویک اینڈ میں ریحانہ اور جہاں زیب کی شادی ہو گئی۔ یہ ایک سادہ اور مختصر تقریب تھی تاہم اس میں دونوں گھرانوں نے اپنی بہت سی خوشیاں پوری کیں۔ اس تقریب میں شرکت کے لیے بیگم نور کا بڑا بیٹا تنویر خاص طور پر امریکا سے آیا تھا۔

شادی کے بعد ریحانہ اپنے گھر چلی گئی۔ عطا کے دل و دماغ سے جیسے ایک بہت بھاری بوجھ اتر گیا تھا۔ کبھی کبھی وہ یہ

سوچتا اور لرز جاتا کہ یہ سب کچھ "باڑی" گاؤں میں ہوا ہوتا تو کیا ہوتا؟ اسے پاکستان سے آئے ہوئے اب ایک سال سے زیادہ ہوگیا تھا۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ بعد میں کیا ہوا؟ اسلم کا ردِعمل کیا رہا؟ کیا رشتے داروں نے اس بارے میں کیا سوچا۔ کیا اسے تلاش کرنے کی کوشش کی گئی؟ وہ کچھ نہیں جانتا تھا اور نہ جاننا چاہتا تھا۔

☆☆☆

اس طرح ڈیڑھ سال مزید گزر گیا۔ ریحانہ اب ایک خوبصورت گول مٹول سے بچے کی ماں تھی۔ وہ بچہ دونوں گھرانوں کا کھلونا تھا۔ سب اسے دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ عطا تو اسے گود سے اتارتا ہی نہیں تھا۔ بچوں سے اسے شروع سے بہت پیار رہا تھا۔ روز و شب جہاں چھوٹے چھوٹے مسائل پیدا کرتے تھے وہاں چھوٹی موٹی خوشیاں بھی ملتی تھیں..... اور زندگی تو نام ہی اس پیاری سی دھوپ چھاؤں کا ہے۔ یہ دھوپ چھاؤں جہاں بھی میسر آ جائے وہی اپنا جہان ہے۔

پاکستان سے آئے ہوئے جب انہیں چار سال گزر گئے تو آصف نے پہلی بار پاکستان فون کیا اس فون کے لیے اس نے عطا محمد سے اصرار کر کے باقاعدہ اجازت لی تھی۔ یہ ایک مختصر سا فون تھا اور آصف نے اپنے اسکول کے ایک دوست کو کیا۔ یہ آصف کا نہایت قابلِ اعتماد دوست تھا اور آصف کو یقین تھا کہ وہ اس فون کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتائے گا۔ اس کا نام زلفی تھا۔

اس فون کال کی وجہ سے ان لوگوں کو پہلی بار باڑی کے حالات کے بارے میں تھوڑا بہت معلوم ہوا ورنہ اب تک تو بالکل بلیک آؤٹ تھا۔ آصف کو اپنے دوست کی زبانی معلوم ہوا کہ ان لوگوں کے باڑی چھوڑنے کے بعد اسلم بالکل ہی آوارہ گرد ہوگیا تھا۔ وہ لاہور اور کراچی وغیرہ میں ان کی تلاش بھی کرتا رہا تھا۔ پھر سلطان پورہ میں چوہدریوں کے لڑکوں سے اس کی چپقلش چل گئی۔ روز مارپیٹ ہونے لگی۔ یہ بھی پتا چلا کہ وہ جوا اور ڈنڈوں کے پاس جاتا ہے۔ اکبر علی نے اکلوتے بیٹے کے منہ زوری کو لگام ڈالنے کی آخری کوشش کی اور اس کی شادی کر دی۔ یہ شادی بھی بے کار ثابت ہوئی۔ ایک لڑکی کی زندگی خراب کرنے کے سوا اکبر علی نے کچھ بھی حاصل نہیں کیا۔ ایک موقع پر باپ بیٹے میں سخت جھگڑا ہوا۔ اکبر علی نے سلطان پورہ والی وہ زمین بھی اسلم سے واپس لے لی جو چند سال پہلے اس کے نام کی تھی (دراصل زمین اسلم کے نام کرنے ہوئے اکبر علی نے احتیاطاً ایک "مختار نامہ عام" اسلم سے پہلے نام لکھوا لیا تھا) اکبر علی نے اچھا ہی کیا ورنہ اسلم نے

تھوڑے ہی دنوں میں یہ زمین اپنے اللوں تللوں میں برباد کر دی تھی۔ تقریباً ایک سال پہلے اکبر علی نے اسلم کو عاق کر دیا اور اخبار میں اشتہار چھپوایا تھا کہ وہ اس کے کسی قول اور فعل کے ذمے دار نہیں۔ باپ اور گھرانے سے ہر طرح کا ناتا ٹوٹنے کے بعد اسلم اب لاہور میں رہتا تھا۔ جس دوست کے ساتھ مل کر اس نے سلطان پورہ میں پراپرٹی کا کام شروع کیا تھا وہ اب رائل پارک میں ایک ہوٹل چلاتا تھا۔ اسلم اسی کے ہاں رہ رہا تھا۔

آصف کو اپنے راز داں دوست زلفی سے ایک بات بھی معلوم ہوئی اور وہ یہ کہ اسلم نے اب بھی ان لوگوں کی تلاش جاری رکھی ہوئی ہے۔ زلفی نے کہا "پہلے اسے شک تھا کہ تم لوگ پاکستان میں کہیں ہو وہ تمہیں چھپے چھپے لاہور کراچی وغیرہ میں ڈھونڈتا رہا لیکن اب اسے یقین ہو گیا ہے کہ تم پاکستان سے باہر جا چکے ہو۔"

زلفی اور آصف میں اس حوالے سے تھوڑی سی بات چیت مزید ہوئی۔ زلفی کی شدید خواہش تھی کہ آصف اسے اپنے بارے میں کچھ بتائے کم از کم یہ تو بتا دے کہ وہ کس ملک میں ہے۔ لیکن آصف نے گفتگو شروع کرتے وقت پہلی شرط ہی یہ رکھی تھی کہ زلفی اس کے WHERE ABOUTS کے بارے میں جاننے کی خواہش نہیں رکھے گا۔

باڑی اور وہاں کے حالات جاننے کے بعد عطا اور اس کا گھرانہ کئی دن تک یاس میں ڈوبا رہا۔ ناخنوں سے گوشت جدا نہیں ہوتا۔ اپنوں کے دکھ دل و دماغ پر اثر کرتے ہیں۔ خاص طور سے عطا محمد نے تو بہت اثر لیا۔ بڑے بھائی اکبر علی کو باپ کی طرح سمجھتا تھا اور اس سے محبت بھی بہت کرتا تھا۔ بڑے بھائی کی پریشانیوں کا سن کر وہ اندر سے چور ہوگیا۔ اس کا دل چاہا اڑ کر اپنے بھائی کے پاس پہنچ جائے۔ اس کے راستے کے کانٹے اپنی پلکوں سے چن لے مگر وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ مجبور تھا۔ اس "بھتیجے" نے اسے مجبور کر دیا تھا جسے وہ کبھی اپنی جان سے بڑھ کر چاہتا تھا۔

دن ہفتوں میں ہفتے مہینوں میں ڈھلتے رہے۔ زندگی اس خوشنما دپرسکون گوشے میں زندگی اپنے تمام تر رنگوں کے ساتھ ایک ہموار ندی کی طرح بہتی رہی..... گنگناتی رہی۔ عطا محمد کا گارمنٹس کا کام ٹھیک چل رہا تھا۔ آصف کو ایک اچھی فرم میں جاب مل گئی تھی وہ اس کے ساتھ اپنی پڑھائی بھی جاری رکھے ہوئے تھا۔ عطا کو اب اس کی شادی کے بارے میں سوچنا تھا۔ جہاں زیب اور ریحانہ کی محبت مثالی تھی۔ وہ ایک بچے کے ساتھ بڑے خوش و خرم تھے۔ سب کچھ ٹھیک ہو رہا تھا

...... بس مٹی سے جدائی کے سوا عطا کو کوئی دکھ نہیں تھا۔ اسی طرح ایک ڈیڑھ سال مزید گزر گیا۔ وہ اکتوبر کی ایک نسبتاً گرم دوپہر تھی۔ دکان کو ہیڈ سیلز مین کے حوالے کر کے عطا لنچ کرنے کے لیے دکان کے عین سامنے ایک فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ میں چلا گیا۔ اس نے برگر اور کولڈ ڈرنک لیا۔ اخبار پڑھنے کے ساتھ ساتھ وہ لنچ بھی کرنے لگا۔ اس کے عین سامنے میز پر ایک اور شخص اخبار پڑھ رہا تھا اس کا چہرہ اخبار کے پیچھے تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے اخبار چہرے سے ہٹایا۔ اسلم مرزا عرف اچھو اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

برگر عطا محمد کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ سکتے کی سی کیفیت میں اسلم کو دیکھ رہا تھا۔ اسلم کی نیم سرخ آنکھوں میں ایک آگ تھی اور اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ وہ بہت کچھ بدل گیا تھا چہرے پر جو تھوڑی بہت شرافت نظر آیا کرتی تھی وہ بھی اب ناپید تھی۔ اس کی پیشانی سے بال اڑ گئے تھے چہرہ بھاری اور ہونٹ سیاہی مائل ہو گئے تھے۔

"سلام علیکم چاچو۔" اس نے سنسنی خیز انداز میں کہا۔

جواب میں عطا محمد کے ہونٹ بس تھرا کر رہ گئے۔

"کیا مجھے یہاں دیکھ کر آپ کو خوشی نہیں ہوئی؟"

"ت..... تم..... کب آئے یہاں..... مم..... میرا مطلب ہے تمہیں کیسے پتا چلا۔ میرا مطلب ہے کہ....." عطا ہکلا کر رہ گیا۔

"چاچو! کہتے ہیں کہ ڈھونڈنے سے ہر شے مل جاتی ہے۔" اسلم نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

وہ بہت بدل گیا تھا اسی لیے تو چاچو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ڈرامائی انداز میں بات کر رہا تھا۔ ورنہ وہ اس کے سامنے ہوں ہاں کے سوا کچھ کہتا ہی نہیں تھا۔

"تم..... پاکستان سے کب آئے؟"

"کوئی دس ماہ تو ہو ہی گئے ہوں گے۔" وہ بڑی بے پروائی سے سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا "تین چار ماہ لندن میں گھومتا رہا۔ آپ کو پتا ہی ہوگا وہاں ایک علاقہ ہے جسے "چھوٹا ہندوستان" کہتے ہیں۔" وہاں بہت وقت گزارا ہے میں نے..... پھر برمنگھم چلا گیا پھر یہاں آگیا..... مجھے یقین تھا کہ آپ ملیں گے تو ولایت میں ہی کہیں ملیں گے۔"

"یہاں کیسے پہنچے؟"

"یہ دنیا اتنی بڑی تو نہیں ہے چاچو! اور یہ شہر تو ویسے بھی چھوٹا سا ہے۔ خیر ان باتوں کو چھوڑیں..... چاچی کیسی ہے؟..... اور آصف..... اور ریحانہ؟" ریحانہ کا نام لیتے ہی اس کی آنکھوں میں عجیب سی وحشت عود کر آئی۔

عطا محمد ایک دم سنبھل گیا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور مستحکم لہجے میں بولا "ریحانہ کی شادی ہو چکی ہے۔ اس کا تین چار سال کا بچہ بھی ہے۔"

"مجھے پہلے سے پتا تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔" اسلم کے سانولے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ ابھری۔

"دیکھو اسلم! وہ بڑی پرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔ کہو تو میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑ دیتا ہوں۔ ان کی زندگی میں کسی طرح کا دخل نہ دینا۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب ان کو اور ہم سب کو جینے دو..... اس کے علاوہ..... اس کے علاوہ تم جو چاہو گے میں کروں گا تمہاری ہر بات مانوں گا۔"

اسلم کی آنکھوں کی سرخی ایک دم بڑھ گئی۔ وہ بالکل اجنبی لہجے میں بولا "تم کون سی بات ماننے کی بات کر رہے ہو چاچو!..... میں تم سے ایک ہی چیز منوانے آیا ہوں۔ اور وہ ہے میرا حق۔"

عطا محمد کے جسم کے ہر مسام نے پسینہ اگل دیا۔ وہ دھندلائی ہوئی نظروں سے اسلم کو دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، عطا کے دو ہم عمر دوست اس فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے۔ وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا اپنی آواز دھیمی کرتے ہوئے اس نے کہا "اسلم! میرے کچھ جاننے والے آگئے ہیں کل شام سات بجے ہم اسی ریسٹورنٹ میں پھر بات کریں گے۔ لل..... لیکن میری ایک درخواست ہے تم سے۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"تم ابھی کسی سے ملنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں خود تمہیں سب سے ملواؤں گا۔ کل ہم اس کے بارے میں طریقہ طے کر لیں گے۔"

"سب میں کون کون شامل ہے؟" اسلم عجیب ڈھٹائی اور بے باکی سے بولا۔

عطا کے تن بدن میں درد کی لہریں دوڑ گئیں۔ پتا نہیں کہ وہ جواب میں کیا کہتا مگر اسی دوران میں اسلم خود ہی اٹھ گیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا مین دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

وہ رات شاید عطا کی زندگی کی بدترین رات تھی۔ اس نے کسی کو کچھ بتایا نہیں تھا۔ بس اپنے آپ میں ہی سلگ رہا تھا۔ تڑپ رہا تھا۔ اسلم کے ساتھ اس کی جو گفتگو ہوئی تھی اس سے یہی اندازہ ہوا تھا کہ وہ یہاں نوٹنگھم میں تنہا آیا ہے۔ غالباً وہ ڈھائی تین ماہ سے یہاں گھوم پھر رہا تھا۔ اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اسے کوئی "کلیو" ملا تھا یا شومئی قسمت اس نے اتفاقاً ہی عطا یا اس کے اہلِ خانہ میں سے کسی کو دیکھ لیا ہے۔

رات آخری پہر تک عطا خیالوں کے تانے بانے بنتا رہا۔ وہ ایک دور اندیش شخص تھا۔ کبھی کبھی وہ وقت سے پہلے ہی بہت دور تک دیکھ لیتا تھا۔ اپنی اس خداداد صلاحیت کی بنا پر وہ اب بھی دور تک دیکھ رہا تھا۔

صبح آٹھ بجے کے لگ بھگ ریحانہ کا فون آیا۔ یہ اس کا معمول تھا کہ یونیورسٹی جانے سے پہلے ایک بار اسے کال ضرور کرتی تھی۔ کہنے لگی "ابو رات کوئی شخص بہت تنگ کرتا رہا۔"

"کیا ہوا؟" عطا کے دل میں ان گنت اندیشے چنگھاڑ اٹھے۔

"کوئی بار بار فون کرتا تھا۔ ہم اٹھاتے تھے تو بند کر دیتا تھا۔ کبھی پنجابی گانے لگا دیتا تھا۔ ایک بار اس نے بھاری بھرکم لہجے میں کچھ کہا بھی لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا...... پتا نہیں کون تھا خبیث......؟"

عطا کے لیے بات کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے دو چار ادھر ادھر کی باتیں کر کے فون رکھ دیا۔ وہ سرتاپا پسینے میں ڈوب گیا تھا۔ اس کے بدترین اندیشے آج حقیقت کا روپ دھار گئے تھے...... نجانے کیوں ان لمحوں میں حضرت صاحب کی کہی ہوئی برسوں پرانی بات عطا کے کانوں میں گونجنے لگی انہوں نے کہا تھا "جو کچھ تو نے اس لڑکے کو دیا ہے ...... ایک دن تو نے اس سے لے لینا ہے......"

یہ بات عطا کے ذہن میں گونجی تو ایک دم سر میں دھماکا سا ہوا۔ عطا کو یوں لگا جیسے ایک دم ہزاروں قمقمے دماغ میں روشن ہو گئے ہیں۔ اس بے رحم روشنی میں ایک بھیانک حقیقت عطا کے سامنے آشکار ہوئی۔ وہ سکتے میں رہ گیا۔ حضرت صاحب کی کہی ہوئی بات کا "اصل مفہوم" برسوں بعد آج عطا کی سمجھ میں آیا تھا۔ اور یہ مفہوم اس کی توقعات سے کہیں بڑھ کر خوفناک تھا۔

انہوں نے کہا تھا "جو کچھ تو نے اس لڑکے کو دیا ہے...... ایک دن تو نے اس سے لے لینا ہے۔" عطا نے اس بات پر بے حد حیرانی ظاہر کی تھی تو حضرت صاحب نے کہا تھا "جو میں دیکھ رہا ہوں وہ تو نہیں دیکھ رہا اور نہ تو وہ سمجھ رہا ہے۔"

آج عطا کو معلوم ہوا کہ حضرت صاحب نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ نہ وہ حضرت صاحب کی طرح دیکھ رہا تھا نہ ان کی طرح سمجھ رہا تھا۔ وہ تو اس بات پر ہی ششدر تھا کہ وہ اپنے اتنے پیارے بھتیجے سے اپنی بیٹی کا ہاتھ واپس لے گا۔ لیکن بات یہ نہیں تھی۔ بات اس سے کہیں زیادہ سنگین تھی۔ اس وقت یہ بات عطا کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ مستقبل کے اس نتائج کو اپنے احاطۂ تصور میں لا ہی نہیں سکتا تھا...... لیکن وقت سب سے بڑا مرہم ہے اور وقت ہی سب سے بڑا روگ بھی ہے۔ یہ روگ انسانوں کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے۔ معصوم صورتیں جن پر فرشتے رشک کریں بگڑ کر ناقابلِ دید ہو جاتی ہیں۔ جان سے پیارے لوگ جانی دشمن بن جاتے ہیں۔ جن کے دامن نچوڑ کر وضو کرنے کو دل مچلتا ہے وہی شیطان بن کر سامنے آتے ہیں ...... ہاں وقت جو بظاہر آہستہ خرامی سے بہتا ہے اپنے اندر تغیر کے طوفان پنہاں رکھتا ہے۔

ہاں حضرت صاحب نے ٹھیک کہا تھا...... تم نے اس لڑکے کو جو کچھ دیا ہے ایک دن اس سے لے لو گے۔

اس وقت عطا کے ذہن میں ایک بات نہیں آئی تھی۔ عطا نے اس لڑکے کو اپنی بیٹی دینے سے کچھ عرصے پہلے ایک اور شے بھی تو دی تھی۔ عطا نے اسے نئی زندگی دی تھی وہ اس کی "جاں بخشی" کا وسیلہ بنا تھا۔ خوفناک لہروں میں لڑی جانے والی وہ "جنگ" ایسا واقعہ نہیں تھی کہ اسے بھولا جا سکتا۔ حضرت صاحب کی رمز برسوں بعد آج اس کی سمجھ میں آئی تھی۔

☆☆☆

ایک ٹھٹھری ہوئی شام زینہ زینہ برگ و بار پر اتر رہی تھی۔ عطا اور اسلم وائلڈ لائف پارک کے ایک پرسکون گوشے میں بیٹھے تھے۔ پہلے کچھ دیر تک انہوں نے فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ میں بات چیت کی تھی پھر اٹھ کر اس پارک میں آ گئے تھے۔ دراصل عطا نے اسلم سے اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ جلد یا بدیر اس کا کوئی جاننے والا یہاں آ جائے گا اور وہ گفتگو کا سلسلہ جاری نہیں رکھ سکیں گے۔"

یہ پارک نسبتاً سنسان علاقے میں واقع تھا۔ ایک مصنوعی ڈھلوان تھی۔ ڈھلوان کے ہموار کنارے پر کرسیاں اور پتھریلی میزیں وغیرہ رکھی رہتی تھیں۔ گرم دنوں میں یہاں اکا دکا افراد نظر آتے تھے مگر اس ٹھٹھری ہوئی شام میں ہو کا عالم طاری تھا۔ بہرحال ویرانی کے باوجود ارد گرد کے مناظر خوبصورت تھے۔ پندرہ بیس میٹر آگے ایک آہنی جنگلا تھا۔ اس جنگلے کے ساتھ کھڑے ہو کر نشیب میں ایک بیضوی جھیل کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ اسے "ایلیگر لیک" بھی کہا جاتا تھا۔ پچھلی مرتبہ عطا اپنی بیٹی ریحانہ اور نواسے رضا کے ساتھ یہاں آیا تھا تو موسم اچھا تھا۔ اور انہوں نے ایک مادہ مگر مچھ کو کنارے پر دھوپ سینکتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔

عطا اور اسلم کے اعصاب کشیدہ تھے اور چہرے تنے ہوئے تھے۔ ان کی اختلافی گفتگو اس نہج پر پہنچ چکی تھی جہاں جذبات پر قابو رکھنا بہت دشوار ہوتا ہے۔

اسلم نے طیش سے کانپتے لہجے میں کہا "چاچو! غلط بات نہ کریں میں صاف لفظوں میں کہہ دیتا ہوں' ریحانہ میری تھی میری رہے گی۔"

"اور میں بھی صاف لفظوں میں تجھے بتا دیتا ہوں وہ تیری نہیں ہے اور نہ کبھی تیری تھی۔"

"تم بھول گئے ہو چاچو لیکن میں نہیں بھولا ...... ہاری کے لوگ نہیں بھولے ...... جب یہ رشتہ طے ہوا تھا جنڈ بانجے بجے تھے دیگیں چڑھائی گئی تھیں۔"

"اپنی اس حماقت کے لیے میں اپنی بیٹی کی ساری زندگی تباہ نہیں کر سکتا تھا۔ پھل جب لگتا ہے تو اسے چکھا جا سکتا ہے یہ دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کاموں کے لیے اس کے بڑا ہونے اور پکنے کا انتظار کرنا پڑتا ہے ...... اور یہ انتظار سب کو کرنا چاہیے۔ ہاں جو بات برسوں پہلے ہوئی تھی وہ حماقت تھی۔"

"نہیں چاچو! حماقت تم نے بعد میں کی جب مجھے دھوکا دیا۔ جب چوروں کی طرح گاؤں سے نکلے اور یہاں پہنچ گئے۔ ہاں مجھے دھوکا دیا گیا ہے اور اس میں چاچی' ریحانہ اور سب شامل ہیں۔" اسلم کا لہجہ تلخ تر ہو رہا تھا۔

عطا محمد کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی چمک گئی اس نے ایک گہری سانس لے کر پتھریلی کرسی کی پشت سے ٹیک لگا دی جیسے کسی حتمی فیصلے پر پہنچ گیا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اوور کوٹ کی جیبوں میں تھے۔ گردن میں ڈبل دار مفلر تھا۔ اس بار جب عطا محمد بولا تو اس کا لہجہ دھیما اور تاسف سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے کہنا شروع کیا "اسلم میں تم سے بڑا پیار کرتا تھا...... اور شاید اب بھی کرتا ہوں ...... لیکن کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ تم ایک بدقسمت شخص ہو۔ میں چاہنے کے باوجود تمہیں کچھ نہیں دے سکا ...... اور شاید دوسرے بھی نہیں دے سکے۔ تم اپنی زندگی پر نگاہ دوڑاؤ تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ اگر تمہیں کسی نے کچھ دیا بھی ہے تو تم نے واپس لوٹا دیا ہے یا اس نے خود تم سے واپس لے لیا ہے۔ تمہاری ماں نے تم سے ٹوٹ کر پیار کیا لیکن آہستہ آہستہ تم نے خود کو اس کے پیار سے محروم کر لیا۔ آہستہ آہستہ ماں کی ساری توجہ تنویر کی طرف ہو گئی اور شاید وہ اب تنویر کے ساتھ ہی رہتی ہے۔ تمہارے استاد ہاشمی صاحب نے تمہیں پیار کیا' تمہیں اپنا ہنر دینا چاہا لیکن اپنی خودسری سے تم نے انہیں بھی ناراض کیا اور وہ تم سے دور چلے گئے۔ تمہارا باپ تمہاری بہتری چاہتا تھا تمہیں کامیاب انسان دیکھنا چاہتا تھا تم نے اسے بھی مایوس کیا۔ میں نے تم سے جتنی محبت کی ہے اپنی زندگی میں کسی سے نہیں کی۔ تم نے مجھے بھی دھکیل دھکیل کر خود سے دور کیا اور پھر بہت دور کر دیا۔ میں نے اپنے دل کی گہرائیوں کے ساتھ تمہیں ایک خوبصورت اور بے مثال تحفہ دیا تھا۔ تم نے چند برسوں میں ہی یہ ثابت کر دیا کہ تم اس تحفے کے قابل نہیں ہو میں مجبور ہو گیا ہوں کہ یہ تحفہ تم سے واپس لے لوں۔ تم اپنی زندگی پر نگاہ دوڑاؤ اسلم! تمہیں شروع سے آخر تک یہی صورتِ حال نظر آئے گی۔ تمہیں کوئی کچھ نہیں دے سکا۔ خواہش کے باوجود نہیں دے سکا۔"

"باتوں کی پھلجھڑیاں مت چھوڑو چاچو! مجھ سے دو ٹوک بات کرو...... میں ...... میں ریحانہ کو طلاق نہیں دوں گا جانتا ہوں۔ بس یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔" اسلم کے لہجے میں بجلی کی کڑک تھی۔

عطا نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔ اس کی آنکھوں میں اسی طرح نمی چمکتی رہی۔ وہ اسی لہجے میں بولا "تمہیں کوئی کچھ نہیں دے سکتا میں بھی نہیں دے سکتا۔ میں نے تمہیں جو کچھ دیا واپس لے لیا۔ ایک آخری چیز رہ گئی تھی وہ بھی واپس لے رہا ہوں۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"زندگی موت تو قدرت کے ہاتھ میں ہے۔ انسان بس وسیلہ بنتے ہیں۔ میں بھی ایک روز وسیلہ بنا تھا اور تمہیں نئی زندگی دی تھی۔ آج یہ زندگی مجھے واپس چاہیے اسلم! مجھے یہ واپس چاہیے۔ اپنی بھولی بھالی بیٹی کی خاطر' اس کی آنکھوں میں چمکتی ہوئی معصوم خوشیوں کی خاطر۔" عطا کا لہجہ عجیب اور خوابناک تھا۔

"کیا کہہ رہے ہو تم؟" اسلم بری طرح چونکا۔

پھر اس کا ہاتھ کسی ہتھیار کے لیے اپنی پھولی ہوئی جیکٹ کی طرف بڑھا مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ عطا کے ہاتھ نے اوور کوٹ کی جیب سے اندر ہی حرکت کی۔ سائیلنسر لگے ہوئے بریٹا پسٹل سے زیادہ آواز نہیں آئی۔ دو دفعہ ٹھک ٹھک ہوا۔ اسلم کی جیکٹ میں دل کے مقام پر دو سیاہ داغ ہو گئے۔ وہ چند لمحے تک خوفناک نظروں سے اپنے چاچو کو دیکھتا رہا پھر پلٹ کر گھاس پر گر گیا۔ چند سیکنڈ میں وہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ زیادہ خون ادھر ادھر نہیں گرا تھا۔ عطا نے خون کے دھبے مٹائے' جیکٹ میں سے وہ تمام اشیا نکال لیں جن سے مرنے والے کی شناخت ہو سکتی تھی۔ اس کے بعد اس نے لاش کو گراسی ڈھلوان پر کھینچا اور پھر نیچے جھیل میں لڑھکا دیا۔ اسلم عرف اچھو شب کی تاریکی میں لڑھکتا ہوا۔ یخ بستہ پانی میں چلا گیا۔ ایسے ہی پانی سے عطا نے برسوں پہلے اسے نکالا تھا...... اس نے اپنا سر گھٹنوں پر جھکایا اور ہچکیوں کے ساتھ رونے لگا۔